Date of Publication: 16-08-2013

PRICE Rs. 2/-

POSTED ON 17-18 August 2013
R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without Prepayment U(C)160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

22-28 August 2013 ۲۲ تا ۲۸ راگست ۲۰۱۳ء

Issue: 32, Vol.: 72 شمارہ نمبر: ۳۲، جلد نمبر: ۷۲

ن.م. راشد کا خط میراجی کے نام

مکرمی،

سلام مسنون۔ آپ سے نیاز حاصل نہیں لیکن آپ کی نظمیں رسالوں میں اکثر نظر سے گزرتی رہی ہیں۔

حال ہی میں 'ساقی' کے مارچ کے شمارے میں آپ کا مضمون "آمیزۂ ادب و سیاست" پڑھا۔ اس مضمون میں آپ نے 'ماورا' کی ایک نظم کا حوالہ بھی دیا ہے اور اس سے یہ استنباط کیا ہے کہ ایسی نظمیں لکھنا مغرب کی نقالی کا نتیجہ ہے۔ آپ کے علم و فضل اور ذوقِ سلیم کے بارے میں جو رائے آپ کے کلام نے پیدا کی تھی، اسے اس استنباط سے بہت صدمہ پہنچا۔ مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ آپ نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کسی قدر تعجیل سے کام لیا ہے، اس لیے ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ بعض باتوں کی وضاحت کردوں۔

کیا ہے، لیکن اس سے شاید یہ ثابت نہیں ہوتا کہ شاعر کو ایسی باتوں کا ذکر کرنے کی ممانعت ہے جو عام فطرتِ انسانی سے زیادہ تعلق رکھتی ہوں اور اس کی مخصوص "جغرافیائی چار دیواری" سے کم۔

دوسری بات یہ ہے کہ میں نے آج تک کبھی مغربی ادب کی عمداً نقالی نہیں کی، اور مجھے اس بات پر حیرت بھی ہے کہ آپ نے اس نظم کو ایسی نقالی کا نتیجہ کیوں کر سمجھ لیا۔ جہاں تک 'ہیئت' کا تعلق ہے، ہمارے ہاں پہلے سے بے قافیہ و ردیف کی شاعری کی مثالیں موجود ہیں اور مختلف نام لے کر عروض و بیان کے ایرانی ماہرین نے اسے تسلیم کیا ہے اور اس بارے میں ایرانی ماہرین ہی اردو شاعروں کے رہنما کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جہاں تک فکر کا تعلق ہے، میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ایسا فکر صرف

میرے نزدیک فطرتِ انسانی جو دنیا کے ہر حصے میں شعر و ادب کا سرچشمہ ہے غیر منقسم اور یکساں ہے، میرے نزدیک انسانی فطرت، جغرافیائی فاصلوں سے بہت کم بدلتی ہے۔ اگر بدلتی ہے تو اس حد تک جس قدر ایک انسان دوسرے انسان سے مختلف ہوتا ہے لیکن اسے فطرت کہنا مشکل ہوگا، جس لحاظ سے ہندستانی فرنگی سے مختلف ہے وہ محض بعض ظاہری باتوں کا فرق ہے یا زیادہ سے زیادہ ماحول کا جس نے زندگی کے بارے میں دونوں کو مختلف نقاط نظر بخشے ہیں۔ یوں تو پنجابی اور حیدرآبادی میں بھی ایک فرق ہے، بلکہ حیدرآباد کے ایک گاؤں کا آدمی دوسرے گاؤں کے آدمی سے انداز نظر میں کئی لحاظ سے مختلف ہوگا لیکن وہ فطرت ہر جگہ یکساں ہے جو شعر و ادب کی تخلیق کرتی ہے، بے شک شاعر اکثر و بیشتر اپنے قریب ترین ماحول کے بارے میں شعر کہتے ہیں، جیسے آپ نے فردوسی کی مثال دے کر واضح

ایک فرنگی ہی کا ہوسکتا ہے ایک ایشیائی یا ہندستانی کیوں جذبات کی شدت کے ایک لمحے کی تصویر کھینچنے کے لیے اس قسم کی تشبیہیں اور استعارے نہیں لاسکتا۔

تیسری بات یہ ہے کہ اگر اس نظم میں آپ کو مغرب کے اثرات کی جھلک دکھائی دیتی ہے تو ان عرب مسلمانوں کو کیا کہیے گا جنھوں نے یونان کے (اور یونان یقیناً نقشے پر یورپ میں واقع ہوا ہے) علوم و فنون سے اکتساب کرنے میں انتہا درجے کی جدیدیت کا اظہار کیا تھا۔ میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو ہم میں سے اکثر جن کی تعلیم صرف عربی اور فارسی کے ذریعے ہوتی ہے "ذہنی ترکیے" سے ہمیشہ کے لیے محروم رہتے۔ عرب مسلمانوں کا بڑا احسان ہے کہ انھوں نے "لِلّٰہ المشرق و المغرب" کی تفسیریوں کی کہ مشرق مغرب کے ذہنی فاصلوں کو عملاً مٹا دیا۔ گو آج ہم بھی یہی کر رہے ہیں لیکن اس کا اعتراف کرنا توہین کا باعث سمجھتے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ آپ نے مغربی زبانوں میں سے کم از کم انگریزی زبان اور اس کے ادب کا مطالعہ ضرور کیا ہے اور مجھے اس بات کا بھی یقین ہے کہ آپ نے یہ مطالعہ بے کار چیز سمجھ کر نہیں کیا، جب آپ نے اسے بے کار چیز نہیں سمجھا تو آپ کے ذہن نے اس سے یقیناً کچھ نہ کچھ استفادہ بھی کیا ہوگا۔ مجھ میں اور آپ میں یہ فرق ہوسکتا ہے کہ آپ اس ذہنی تربیت کا 'کفران' کرنا پسند کرتے ہیں، میں اس کی قدر دانی کر کے اس کا 'شکر' ادا کر رہا ہوں۔ آپ ریل گاڑی میں سوار ہونے کے عادی ہیں، لیکن یہ کہ اگر کوئی ہوائی جہاز میں سوار ہونا چاہے تو اسے یقیناً یہ طعنہ نہ دیں گے کہ وہ ہندستان میں یورپ قائم کر رہا ہے۔ میں حال ہی میں ایران، عراق، فلسطین اور مصر میں سوا دو سال کے قیام کے بعد ہندستان واپس آیا ہوں۔ اگر آپ کو ان 'اسلامی' ملکوں کی زیارت نصیب ہو تو شاید اپنی 'مشرق پرستی' پر ناز کرنا ترک

کردیں، مجھے ان ملکوں میں کہیں مشرق نظر نہیں آیا۔ جن مشرقی اداؤں سے ہم اپنے آپ کو وابستہ دیکھ کر خوش ہوتے ہیں وہ تیزی سے فنا ہوتی جارہی ہیں اور مجھے ہمیشہ یہ اندیشہ محسوس ہوا ہے کہ یا ہمیں دنیا کو پھر Convert کرنا پڑے گا یا ہم دنیا کی برادری میں اچھوت بن کر رہ جائیں گے۔ یہ نہ سمجھیے کہ ان ملکوں میں مغرب کی ملوکیت پرستی کے خلاف جذبہ ہم سے کسی حد تک بھی شدت میں کمتر ہے۔ لیکن ان ملکوں نے روزانہ زندگی کا راز ہم سے بہتر پالیا ہے۔ میں نے اکثر لوگوں سے کہا کہ تم مغربی تہذیب کی رو میں کیوں بہتے چلے جارہے ہو۔ لیکن جواب ملا کہ نقشہ پر لکیر کھینچ کر بتادو کہ کہاں مغرب ختم ہوتا ہے اور مشرق شروع۔ اگر آپ اس بات پر کبھی غور فرمائیں تو آپ کو بھی وہی مشکل درپیش ہوگی جو مجھے یہ جواب سن کر ہوئی تھی۔

چوتھی اور آخری گزارش یہ ہے کہ مجھے میرے اور آپ کے وطن ہی نے سنسکرت، ہندی اور اردو کی تعلیم سے زیادہ انگریزی کی تعلیم دی ہے۔ میں عربی اور فارسی کو اس میں شامل نہیں کرتا کیوں کہ خارجی زبان ہونے کے اعتبار سے وہ انگریزی سے کمتر نہیں اور جہاں تک میری ہندستانی فطرت کا تعلق ہے وہ بھی میرے لیے اسی قدر 'معتبر' ہونی چاہیے جس قدر انگریزی، فرانسیسی یا روسی! اگر میری تعلیم میں سنسکرت اور ہندی اور اردو کا عنصر کماحقہٗ شامل ہوتا تو میں بھی شاید شیکسپیئر، کیٹس اور بائرن کے جنازوں کو کندھا دینے میں آپ کا شریک ہوجاتا لیکن اب تو میں نے ان کا مطالعہ کیا ہے اور میں محسوس کرتا ہوں کہ حکمت و فن صرف کالی داس، سعدی اور حافظ کی اجارہ داری نہ تھی۔ امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔ والسلام

نیاز مند۔ ن.م. راشد

(بہ شکریہ 'شعر و حکمت' [کتاب-۱] ۱۹۸۷، حیدرآباد)

زبان و بیان کے بعض پہلو

دوسری اور آخری قسط

رشید حسن خاں

صحیح اور مناسب ترین لفظ کا انتخاب بے حد اہم مسئلہ ہے۔ متعدد مترادف الفاظ میں سے صحیح لفظ کو اختیار کرنا اور کس مفہوم کے لیے کون سا لفظ وضع کیا گیا ہے، اس کو پیش نظر رکھنا بے حد ضروری ہے۔ قدیم صاحب نظر شعرا نے کہیں کہیں کسی چیز کی مخصوص صفت کو دوسری چیز سے متعلق کر دیا ہے، کسی کیفیت کو ظاہر کرنے کے لیے جو لفظ آنا چاہیے اس کے بجائے ایک دوسرا لفظ استعمال کیا ہے؛ لیکن اس تصرف میں اس حد تک تناسب و احتیاط سے کام لیا ہے اور شیوۂ کار آگہی کا ایسا ثبوت پیش کیا ہے کہ غور کرنے کے بعد آدمی وجد کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ جناب آرزو لکھنوی نے اپنی کتاب 'نظام اردو' میں اس پر خاص روشنی ڈالی ہے، میں انھی کی عبارت کا ایک اقتباس پیش کرتا ہوں:

"دمک ایک خاص طرح کی تابندگی کا نام ہے، جس کا استعمال ستارہ، کندن وغیرہ کے ساتھ مخصوص ہے لیکن میر انیس کہتے ہیں:

مٹی میں وہ دمک تھی کہ کندن بھی گرد تھا

شاعر مٹی سی کم حقیقت چیز کو کندن سی بیش قیمت شے پر ترجیح دینے کے لیے جو صفت کندن کی تھی، اُسے مٹی کے ساتھ استعمال کرتا ہے اور 'وہ' حرف ترقی لا کر بتاتا ہے کہ مٹی کی چمک کندن کو مات کر رہی تھی اور لفظ گرد، جو مٹی کے لیے وضع ہوا تھا، مات کی جگہ صرف کر کے مٹی کو سونا اور سونے کو مٹی بنا دیتا ہے۔ اگر مصنف موصوف نے کندن کی صفت مٹی کے ساتھ لا کر مٹی کی صفت کندن کے ساتھ نہ استعمال کی ہوتی، تو جملہ بے معنی یا غیر فصیح ہو جاتا"۔

(نظام اردو، ص ۵۹)

آب، چمک، دمک، ڈلک؛ قریب المعنی الفاظ ہیں، لیکن سب کا محل استعمال جدا جدا ہے۔

ہمارے بہت سے نئے شاعر جس بے دردی اور بے امتیازی کے ساتھ قریب المعنی الفاظ کو استعمال کرتے ہیں، اس لحاظ سے لپٹ، بھبک اور مہک میں کوئی امتیاز نہیں ہونا چاہیے۔

دہاڑنا، چنگھاڑنا، جنہنانا، پھنکارنا، کوکنا؛ سب الگ الگ لفظ ہیں، جو بعض جان داروں کے لیے مخصوص ہیں؛ اب آپ سارے امتیازات ختم کر کے کہیے کہ سانپ چنگھاڑ رہا تھا، ہاتھی پھنکار رہا تھا اور گھوڑا بلبلا رہا تھا؛ تو یہ کون سی معقول بات ہوگی؟

ذیل میں کسی تشریح کے بغیر الفاظ کے بے محل استعمال کی کچھ اور مثالیں درج کی جاتی ہیں۔ خط کشیدہ الفاظ کا صرف قابل توجہ ہے:

صدا سے تیشہ کامراں ہو کوہکن کی جیت ہو
(مخدوم)

آغاز وفا کی دھاروں پر انجام وفا سے ڈرتے تھے
(سلیمان اریب)

میرے چپے میں تھی ہوئی جیسی آغوش پرائی میں
(ساحر)

آ جاؤ دست ہو گئی میرے لہو کی تال
(فیض)

دست قدرت کے تراشے ہوئے دو برگ گلاب
(سردار جعفری)

سر پہ ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
(مجروح)

آج تک شیخ کے اکرام میں جو شے تھی حرام
(فیض)

بول کچھ بول مقتول لب اظہار سہی
(مجروح)

دیکھ رہے تھے ہمیں جس کے لیے گئے آنسو
(مجروح)

بچیں اس قدر سی منزلیں کہ قدم کے خاک نکل گئے
(مجروح)

تو ہے جاو اس مجروح جس میں سارح ساعت ہو
(مجروح)

(اس دیدہ وری کا کیا ٹھکانا ہے کہ شاعر کی نظر میں روح عصر اور روح ساعت میں کوئی فرق نہیں)

کوئی وہ شعلہ تو ہو پاشمہ ہو پگھل جائے
(خورشید الاسلام)

دل سبک اور سادہ ہے اس طور سے قرض جیتے تھے کو یاد ہو گئے
(خورشید الاسلام)

آوارگی کی سیاحت کہاں سے لائیں
(جذبی)

دھڑکا رہے ہیں پھر بھی دل کائنات ہم
(جذبی)

دو گھڑی کر ہے فقر و کج سے فارغ
(خورشید الاسلام)

حرم سے گزرے تو شیخ حرم سے لڑ بیٹھے
مغاں میں پہنچے تو پیر مغاں سے روٹھ گئے
(خورشید الاسلام)

(یہ بات قابل داد ہے کہ اردو کا ایک استاد اور مشہور ناقد مغاں کو حرم کا متضاد سمجھ رہا ہے)

الفاظ کے غلط استعمال کی خامی اُس وقت زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے، جب وہ محاورے یا روز مرہ پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ایسی صورتوں میں شعر نہایت غیر مناسب طرز بیان سے گراں بار ہو جاتا ہے اور فصاحت کلام قطع تعلق کر لیتی ہے، جیسے:

ہمیں نے دھاتوں کی نبض پرکھی، ہمیں نے ذروں کا دل ٹٹولا
(سردار جعفری)

نبض پرکھنا اور ذروں کا دل ٹٹولنا صحت کلام، روز مرہ اور حسن بیان کو منہ چڑانا ہے۔

خاموش زمیں کے سینوں میں خیموں کی طنابیں گڑنے لگیں (ساحر)

کبھی ہوئی دوشیزاؤں کی مسکان بھی بکی جاتی ہے
(ساحر)

وہ بھولی بھالی روحوں کی پہچان بھی بکی جاتی ہے
(ساحر)

طنابیں گڑنا، مسکان بکنا، پہچان بکنا، جیسے مرکب افعال استعمال کرنے کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ شاعر جس زبان میں شعر کہہ رہا ہے، اُس زبان کی معمولی معلومات سے بھی بے بہرہ ہے:

کون الجھے ہوئے بالوں کی گرہ سلجھائے
(ساحر)

آ جاؤ میں نے سن لی ترے ڈھول کی ترنگ
(فیض)

دو بے آنگن میں ڈوریوں پہ ٹنگے ہوتے ہیں
(سردار جعفری)

غم گساروں سے بھی اب چشم کرم جاتی رہی
(خورشید الاسلام)

گرہ سلجھانا، ترنگ سننا، دوپٹے ڈوریوں پر ٹانگنا اور چشم کرم جاتی رہنا، یہ سب پریشاں گفتاری کے ذیل میں آتے ہیں۔

کیا جو دل نے جنوں سارباں سے روٹھ گئے
(خورشید الاسلام)

تمھیں بھی ہم سے رم ہونے لگا ہے
(خورشید الاسلام)

یہی گھر جو حرم ہونے لگا ہے
(خورشید الاسلام)

جنوں کرنا، رم ہونے لگنا، حرم ہونے لگنا، بدمذاقی کے عبرت ناک مرقعے ہیں۔ ان حضرات کی ایسی خوش فعلیاں دوسرے بہت سے نا پختہ حضرات کو گم راہ بنانے میں ضرورت سے زیادہ معاون ثابت ہوتی ہیں:

ہر قدم آگے بڑھانے کے لیے خون کی بھینٹ
ایسے بھی اے غم دل کتنے مقام آئیں گے
(جذبی)

نئے بل سے زوروں کو سکھائے
(جذبی)

دھڑکا رہے ہیں پھر بھی دل کائنات ہم
(جذبی)

دل دھڑکانا، بل سکھانا، زور سکھانا، خون کی بھینٹ آگے بڑھانا بھی اردو کے ایک استاد کے فرمودات ہیں۔ چو کفر از کعبہ برخیزد۔

ہم ایک بار تری آرزو بھی کھو دیتے
(مجروح)

پھر اٹھ کے گرم کریں کاروبار زلف و جنوں
(مجروح)

اب وہ غم زدوں رہتے ہیں جن کو غم زدوں ہونا تھا
(مجروح)

اب جنوں پہ وہ ساعت آ پڑی کہ اے مجروح
(مجروح)

آرزو کھو دینا، کاروبار گرم کرنا، غم ہونا تھا، ساعت آ پڑنا، یہ سب اسی ذیل میں آتے ہیں۔

ہر ایک اقرار سب کیا ہے تمام پیغام بجھ گئے ہیں
(فیض)

کہ دل پہ کس کس کا نقش باقی ہے کون سے نام بجھ گئے ہیں (فیض)

دراز قد جیسے سرو کی نماز کر سے
(فیض)

کچھ اپنی سزا کو پہنچیں گے کچھ اپنی جزا لے جائیں گے (فیض)

ہر درد کو اجیالا ہر اک غم کو سنوارا
(فیض)

اب وہی حرف جنوں سب کی زباں ٹھہری ہے
(فیض)

پیغام بجھ جانا، نام بجھ جانا، نماز کرنا، جزا لے جانا، درد کو اجیالنا، زبان ٹھہرنا صحت زبان کے دائرے سے یکسر خارج ہیں۔

ایسی غلط نگاری اُس وقت دو آتشہ ہو جاتی ہے، جب کسی غزل کی ردیف و قوافی پر اُس کی مکمل گرفت ہو۔ ایسی غزلیں بدذوقی کا شاہکار بن کر رہ جاتی ہیں، جیسے:

غم کدے وہ جو ترے گام سے جل اٹھتے ہیں
بت کدے وہ جو مرے نام سے جل اٹھتے ہیں
رات تاریک سہی میری طرف تو دیکھو
کتنے مہتاب ابھی جام سے جل اٹھتے ہیں
ذہن شاعر میں وہ انوار سحر کا عالم
جب چمن شبنم الہام سے جل اٹھتے ہیں
وہ چمن بھی نہ ہوئے وجہ نشاط غم دل
جو چمن عارض گلفام سے جل اٹھتے ہیں
(سلیمان اریب)

ردیف ہر جگہ بے جوڑ ہے۔ یہ عیب بھی اس وقت عام ہے۔ ستم یہ ہے کہ نو مشق شاعر بعض اوقات ایسی سنگلاخ زمینوں کا انتخاب کرتے ہیں، جن کا سر سبز ہونا مشکلات کے ذیل میں آتا ہے اور پھر اُس مشکل زمین میں پریشاں گفتاری کے عجیب عجیب مظاہرے دیکھنے میں آتے ہیں۔ شعر بایں ہمہ کے دوسرے الفاظ و مرکبات کی نسبت سے الفاظ کے انتخاب کی بھی خاص حیثیت ہے۔ اچھے شعر میں ایک لفظ بھی غیر متناسب ہو، تو اُس کا حسن دھندلا جاتا ہے۔ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ اچھی خاصی نظم یا غزل کو صرف چند غیر متناسب الفاظ تباہ کر دیتے ہیں۔ بعض مثالوں سے اس کا اندازہ ہوگا۔ ایک نظم کے دو بند دیکھیے:

ریزۂ سنگ سہی پھول کی نازک پتی
تودۂ خاک سہی پیکر ابن آدم

ذرّہ ذرّہ ریگ سی تکلب کا ایوانِ حسیں
قطرۂ بحر سی وسعت ہر دو عالم

یہ جہاں خواب سی ایک پریشان سا خواب
جس کی تعبیر ہے اک تیرہ و تاریک خلا
جس کی پہنائی میں اُڑتے ہیں وہ ننگے بھنگے
نوعِ انساں کے بگولے ہیں فقط جن کی غذا

پہلا بند بہ لحاظِ انتخاب و ترتیبِ الفاظ خوب ہے۔ دوسرے بند کا پہلا شعر بھی ایسا ہی ہے۔ تینوں شعروں میں نہایت شستہ فارسی ترکیبیں ہیں لیکن دوسرے بند کے تیسرے مصرعے کو پڑھتے ہی پہلے اشعار کا حسن بھی ختم ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ’ننگے بھنگے‘ نظم کر کے شاعر نے تناسبِ بیان کو ذبح کر دیا ہے۔ ایک اور نظم کے یہ دو بند دیکھیے

تری ہی دین سی قوتِ ستارہ شکار
لرز رہا ہے مگر میرا عزمِ طور آثار
مرا کلام ہے میری تڑپ کا آئینہ دار

عمل کے دشت میں جب عزم ہو زمانے کا
افق پہ نجمِ سحر جب نقاب اٹھائے گا
تو میری شعلہ مزاجی کو چین آئے گا

ملاحظہ فرمایئے، ایک طرف قوتِ ستارہ شکار، عزمِ طور آثار، شعلہ مزاجی، آئینہ دار جیسی ترکیبیں ہیں، دوسری طرف انھی کے پہلو بہ پہلو عزم بھی دندنا رہا ہے! پانچ مصرعوں کی ساری دل کشی ایک مصرعے کی دندناہٹ سے تباہ ہو گئی۔

چپ چاپ خلاؤں میں ظلمت نے علم کھولے
سوچوں کے سمندر میں آنے لگے ہچکولے

’سوچوں کا سمندر‘ کیسی بارِ سماعت ترکیب ہے!

نظم تو پھر بھی وسیع الذیل صنف ہے، بعض معمولی خامیاں اُس کی وسعت میں سما سکتی ہیں لیکن غزل میں معمولی سی خامی بے حد نمایاں معلوم ہوتی ہے۔ بہت سے غزل گو شعرا اس پہلو کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور غزل میں ایسے الفاظ نظم کر دیتے ہیں کہ شعر کا سارا حسن تباہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً:

رفتہ رفتہ منقلب ہوتی گئی رسمِ چمن
دھیرے دھیرے نغمۂ گل بھی قفس بنتا گیا
(مجروح)

زمانہ ہو چکا اس اولیں مڈبھیڑ کو لیکن
سنائی دے رہی ہے تیری نظروں کی پکار اب تک
(مخمور)

میں دشتِ اداسی شکنوں کے سہارے جی لوں گا
مرے دکھوں کی کوئی انتہا نہیں نہ سہی
(مخمور)

اب سے چند سال پہلے تک شعریت سے محروم، غزل کے مزاج سے میل نہ کھانے والے الفاظ سے بوجھل اور حسنِ بیان سے معرا غزلیں کہنا شیوۂ آگہی سمجھا جاتا تھا۔ کوشش کی جاتی تھی کہ غزل پر مذاقِ سلیم کی پرچھائیں نہ پڑنے پائے اور حسنِ بیان کی صفت شامل نہ ہو سکے۔ کبھی کبھی تو یہ محسوس ہوتا تھا کہ پریشاں گفتاری کا باقاعدہ مقابلہ ہو رہا ہے۔ میں مثال میں صرف ایک غزل درج کرتا ہوں، یہ غزل مجروح کی ہے:

امن کا جھنڈا اس دھرتی پر کس نے کہا لہرانے نہ پائے
یہ کوئی [illegible] ساتھی جانے نہ پائے
امن و محبت کے سائے میں کھلتے ہیں آتی ہے جوانی
اب نہ آگے [illegible] جنگ لہو برسانے نہ پائے
[illegible] انسان نے
مشکل سے سیکھے ہیں یہ [illegible] الجھانے نہ پائے
اپنے ہی [illegible] میں پھر آئی من من کی ہو
[illegible] کام آنے نہ پائے
امن ترا جیون کا [illegible] ہے موت کا [illegible]
[illegible] آنکھ میں [illegible] کھانے نہ پائے

مجروح کے مجموعے ’غزل‘ میں ایسی کئی غزلیں اور متعدد اشعار ہیں۔ سردار جعفری نے اس کے دیباچے میں مجروح کی خصوصیاتِ شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

”ایک اور خصوصیت جو مجروح کو عام غزل گو شعرا سے ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ انھوں نے سماجی اور سیاسی موضوعات کو بڑی کامیابی کے ساتھ غزل کے پیرائے میں ڈھال لیا ہے۔ عام طور سے غزل گو سماجی اور سیاسی موضوعات کے بیان میں پھیکے اور سپاٹ ہو جاتے ہیں یا ان کا اندازِ بیان ایسا ہو جاتا ہے کہ نظم اور غزل کا فرق باقی نہیں رہتا۔ مجروح کے یہاں یہ بات نہیں“۔

اسی قسم کی جانب دارانہ، مصلحت پسندانہ اور گمراہ کن رائیں بہت سے نئے شاعروں کو بے راہ رو بنانے میں معاون ثابت ہوتی ہیں (’غزل‘ پر میں مفصل تبصرہ لکھ چکا ہوں)۔

ہم کو یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ اچھا خیال صحیح اندازِ بیان سے آراستہ ہو کر داد طلب ہو سکتا ہے۔ جس طرح صرف الفاظ کی تکرار و رعایت اور محض صنعت گری سے شاعرانہ خوبیاں گرفت میں نہیں آتی ہیں، اسی طرح صحیح اسلوب نہ ہونے سے بھی خیال کا حسن خاک میں مل جاتا ہے۔

رسالہ ’سوغات‘ (بنگلور) نے حال ہی میں جدید نظم نمبر شائع کیا ہے۔ اس میں اس زمانے کے بہت سے اچھے بُرے شاعروں کی نظمیں جمع کی گئی ہیں۔ ان سب نظموں کو دو راتیں کر سوچ سمجھ کر اور ان کا مفہوم سمجھنے کی خاطر سنبھل سنبھل کر پڑھا جائے تو معلوم ہوگا کہ آج کل ہمارے نوجوان شاعروں کا ایک گروہ ایک طرف تو ابہام کے جال میں از سرِ نو گرفتار ہو رہا ہے، بیان کی پیچیدگی اپنی ساری حدیں توڑ چکی ہے اور بہت سی نظموں کو سمجھنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ خود شاعر یا اس کے شارحین کے طویل نوٹ بھی بہ طورِ حاشیہ شامل نہ ہوں۔ (رسالہ ’ادبی دنیا‘ (لاہور) کے کئی شماروں میں اس کی مثالیں بکھری ہوئی ہیں کہ ایک نظم کے چار حضرات نے چار مختلف مفاہیم بتائے، اور جب شاعر صاحب کا نمبر آیا تو انھوں نے ان سب کے مفاہیم پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا)۔

دوسری طرف اسلوبِ بیان کی اجنبیت بھی سارے مرحلے طے کر چکی ہے اور اس سے لطف اندوز ہونا اس وقت تک ممکن نہیں ہے، جب تک کہ مذاقِ سلیم اور حسنِ بیان سے کچھ دیر کے لیے دست برداری کا اعلان نہ کر دیا جائے۔ یہ صورتِ حال (جس کا جواز سماجی انتشار میں تلاش کیا جاتا ہے) بہ ہر صورت اس لائق ہے کہ اس طرف توجہ کی جائے۔ جدید نظموں کے بعض نمونے دیکھ کر کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بعض نو رسیدہ و نارسیدہ شعرا نے شاعری کو خوش فعلی کا مرادف سمجھ لیا ہے۔ آسان پسندی سے زیادہ ذہنی انتشار پسندی نے ان کی بعض حسیات کو مفلوج کر دیا ہے۔ امریکی معاشرت کی کورانہ تقلید سے جس طرح روزمرہ کی زندگی میں عجیب عجیب نمونے دیکھنے میں آتے ہیں، لباس میں لہجے میں، بے اعتدالی میں اور بے پروا خرامی میں جس جس طرح دادِ تقلید دی جاتی ہے، اسی طرح خیالات کی ترتیب و تنظیم اور ضبطِ شوق کے بھی پرزے اڑانا بعض حضرات کے نزدیک داخلی حسنات ہونے کے مرادف ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ قاعدوں اور ضابطوں سے شاعر کو ایسی واقفیت ہو جیسی مدرسے کے ایک طالب علم کو ہوتی ہے۔ یہ تو شاعری کا میکانکی تصور ہے۔ ہاں یہ بات بہت ضروری ہے کہ قدیم ادب کے جواہر پاروں کا برابر مطالعہ کیا جائے تاکہ ذوق کی تربیت ہوتی رہے اور پیرایۂ بیان کی خوبیوں کا احساس بڑھتا رہے۔ شاعری میں خیال اور پیرایۂ بیان، دونوں کے لحاظ سے کم پر قناعت کر لینا گناہ ہے۔ یہاں تو خوب سے خوب تر کی تلاش بلندی کی ضمانت ہے۔

ہمارے نئے شاعروں کے پاس اچھے خیالات کی کمی نہیں، ان کی قوتِ تخیل نئے نئے راستوں پر پرواز کرتی رہتی ہے، لیکن جب وہ ان خیالات کو پیش کرتے ہیں، اس وقت عجزِ بیان آنکھیں دکھاتا ہے اور ان کے خیالات غلط پیرایۂ بیان یا غیر متناسب الفاظ کے بوجھ سے دب کر دم توڑ دیتے ہیں۔ جب اس غیر فن کارانہ عمل کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے، فوراً چند مخالف الفاظ سے اس شخص کے مزاج و نظریات کا تجزیہ شروع کر دیا جاتا ہے۔ تفتیش کی جاتی ہے کہ اس کے یہاں دورِ جاگیرداری کے کس قدر اثرات ہیں اور یہ کس مرتبے کا قدامت پرست یا رجعت پرست ہے۔ آخر میں فتویٰ دے دیا جاتا ہے کہ اس شخص کا ذہن اس قابل ہے ہی نہیں کہ ان الہامی باتوں کو سمجھ سکے۔ اس طرح بہ یک جنبشِ قلم نادر اور نادری دونوں کا صفایا کر دیا جاتا ہے۔

خیال کی اہمیت اور اوّلیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ایک زمانے میں غزل پر لفظی بازی گری کے جو اثرات پڑے تھے اور جس کے کچھ انعکاسات اب بھی کبھی کبھی دیکھنے میں آ جاتے ہیں، اُن سے ہم سب واقف ہیں اس لیے کوئی بھی صاحبِ نظر مطلق لفظ پرستی کو اچھا نہیں کہہ سکتا۔ پھر یہ بھی ہے کہ تمدن و معیشت کے انقلابات کے نتیجے میں ادب میں خیالات کی رو بدلتی رہتی ہے، اس سے کون چشم پوشی کر سکتا ہے لیکن خیالات کے راستے کتنے ہی بدل جائیں اور زندگی کی الجھنیں خیالات میں کتنی ہی پیچیدگیاں پیدا کر دیں، ان کے اظہار میں بہر طور اس بات کا لحاظ رکھنا ہوگا کہ وہ زبان و فن کے لوازم سے معرّا نہ ہونے پائیں۔ خیال ہر شخص کے ذہن میں ہوتا ہے اور ہر شخص اس کو ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں ادا کر سکتا ہے۔ اگر شاعری تخلیقات کو پرکھنے کا کوئی معیار نہ ہو اور اس کے لیے کوئی قید ضروری نہ سمجھی جائے، تو اس کی فن کاری کا کیا مصرف ہوگا؟ — الفاظ و اسالیب جامد چیزیں نہیں ہیں، ان میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اور ہوتی رہیں گی؛ لیکن اس بنا پر انکارِ لزوم کا جواز نہیں نکل سکتا۔ ترمیم و اضافے کے لیے ضروری ہے کہ زبان کے مزاج اور اسالیب کا لحاظ رکھا جائے۔

ہر زبان کا مزاج اور تقاضے جداگانہ ہوتے ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ کسی زبان کے مخصوص مرکبات یا خاص اسلوبِ بیان کا لفظی ترجمہ کر دینا نہ کمال کی بات ہے نہ قابلِ فخر ہے، یہ تو عجزِ شاعرانہ کا اظہار بلکہ اعلان ہے۔ غالب کی بھاری بھرکم شخصیت سے کون واقف نہیں۔ ان کی پُر رعب آواز اور پُر وقار لہجے سے سب مرعوب ہیں، لیکن اس سارے سروسامان کے باوجود ان کے کچھ نادر ترشے قبولِ عام حاصل نہ کر سکے۔ جب تک وہ تماشا گر اور انتظار کھینچ جیسے مرکبات سے کام لیتے رہے اور پیچیدہ بیانی میں بیدل کا رنگ جھلکتا رہا، معیار و قبولِ عام منہ پھیرے رہے، تا بہ دیگراں چہ رسد۔

ہر زبان دوسری زبان سے مسلسل استفادہ کرتی ہے لیکن استفادے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہر چیز بعینہٖ نقل کر دی جائے۔ استفادے کا مطلب تو یہ ہے کہ ہر زبان سے ان چیزوں کو لے لیا جائے جو ہمارے کام کی ہیں اور اس طرح کہ چراغ سے چراغ جل اٹھے یہ نہ ہو کہ کمخواب میں ٹاٹ کا پیوند لگا دیا جائے۔

عربی کی وسعت سے کس کو انکار ہوگا۔ فتحِ ایران کے بعد عربی نے فارسی کو متاثر کرنا شروع کیا، لیکن اہلِ ایران کی خوش ذوقی نے تفریس کے قاعدے سے کام لے کر ان الفاظ کو جو ایرانی لہجے سے میل نہیں کھاتے تھے، اپنے سانچے میں ڈھال لیا۔ وہ بحریں جو عربی کے مزاج کے عین مطابق تھیں، لیکن فارسی سے میل نہیں کھاتی تھیں، ان کو چھوڑ دیا۔ ان کے بجائے نئے نئے زحافات سے مرکب ایسے شگفتہ و مترنم اوزان اختیار کیے جو ان کے مزاج کے مطابق تھے۔ اگر اس وقت ایرانی اہلِ زبان وہی کرتے، جو آج اردو کے مغرب زدہ حضرات کر رہے ہیں، تو وہی اونٹ کی مینگنیاں محبوب کے تِل کی قائم مقامی کرتیں، وہی چکنی چپٹی مسواکیں محبوب کی نرم و دراز انگلیوں کے کام آتیں اور عربی کے ثقیل لفظ فارسی کی لطافت و شیرینی کو مرحوم کر چکے ہوتے۔

غرض کہ نئے اضافے کرتے وقت یہ سوچنا ضروری ہے کہ وہ زبان کے معیار اور اس کے مزاج کے مطابق ہیں یا نہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں شاعری دیدہ وری و فن کاری کی آزمائش ہوتی ہے۔ سورج کو اگر کوہِ طور بنا دیا جائے یا ذرّوں کے جگر سے انقلاب کے نعرے برآمد کیے جائیں تو یہ محض خوش فعلی ہوگی۔ یہ ویسی ہی بات ہوگی جیسے ایک تبصرہ نگار نے ایک ڈراما نویس کی تعریف کرتے ہوئے لکھا تھا ”وہ دنیائے ڈراما کے ناخدا تھے“۔ تبصرہ نگار نے زمین پر کشتی چلا کر ڈراما نگار صاحب کو جس طرح ناخدا بنایا ہے بہت سے شاعر بھی اسی قسم کی باتیں کرتے ہیں۔

⊙⊙⊙

اردو دُنیا

اردو درسی کتابوں میں فاش غلطیوں کی اسمبلی میں گونج

رکن اسمبلی ابو عاصم اعظمی نے سرکار سے مطالبہ کیا کہ فوری طور پر غلطیوں کو درست کیا جائے

ممبئی (۳۱ رجولائی)۔ ریاستی اسمبلی میں اردو کی دسویں اور بارھویں جماعت کی درسی کتابوں میں املے اور دیگر غلطیوں کا معاملہ ایوان میں گونجا۔ اجلاس کی کارروائی کے دوران رکن اسمبلی ابو عاصم اعظمی نے کتابوں میں غلطیوں کی جانب نشان دہی کرتے ہوئے سخت احتجاج کیا اور سرکار سے مطالبہ کیا کہ فوری طور پر غلطیوں کو درست کیا جائے۔ اجلاس کی کارروائی کے دوران رکن اسمبلی ابو عاصم اعظمی نے تحریک التوا کی نوٹس کے ذریعے کتابوں میں غلطیوں کا معاملہ ایوان میں اٹھایا اور تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اردو اساتذہ کی تنظیم اردو ٹیچر ایسوسی ایشن نے اردو کی دسویں جماعت کی کتاب میں ۲۶۰ اور بارھویں کی کتاب میں ۵۵۰ غلطیوں کی نشان دہی کی ہے۔ ابو عاصم اعظمی نے کہا کہ اس تعلق سے اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن نے متعلقہ محکموں کے ذمہ داران سے ملاقات کی اور اس جانب ان کی توجہ مبذول کرائی لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ کالجوں میں دسویں اور بارھویں کی پڑھائی شروع ہوئے دو ماہ سے زائد عرصہ گزر چکا ہے لیکن اب تک غلطیوں کو درست کرنے کی کوئی کارروائی نہیں کی گئی ہے، یہ بڑے تشویش کی بات ہے۔ ابو عاصم اعظمی نے درسی کتابوں میں املا اور دیگر غلطیوں کی جانب سرکار کی توجہ دلائی اور چند اقتباسات پڑھ کر ایوان میں سنایا اور کہا کہ غلطیوں کی وجہ سے جملوں کا مفہوم ہی بدل جارہا ہے۔

(انقلاب، دہلی)

اردو میڈیم کے طلبہ کو نصابی کتابیں نہیں مل رہی ہیں

وزیر برائے فروغ انسانی وسائل پلم راجو کو دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین کا مکتوب

نئی دہلی (۲۹ رجولائی)۔ پرائمری سے سینئر سیکنڈری تک نصابی کتابیں مہیا کرانے کے لیے ذمہ دار این سی ای آر ٹی واجد حالی میں اردو میڈیم کے طلبہ کو وقت پر نصابی کتابیں مہیا کرانے میں پوری طرح سے ناکام ہے، جس کی وجہ سے اردو میڈیم طلبہ کی تعلیم پر تو اثر پڑ ہی رہا ہے ساتھ ہی یہ لسانی اقلیت کے حقوق کی خلاف ورزی بھی ہے۔ ان خیالات کا اظہار اردو اکادمی دہلی کے وائس چیئرمین پروفیسر اختر الواسع نے مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل پلم راجو کو بھیجے ایک مکتوب میں کیا ہے۔

پروفیسر اختر الواسع جو وزارت فروغ انسانی وسائل کی مسلم تعلیم سے متعلق مانیٹرنگ کمیٹی کے رکن بھی ہیں، انھوں نے وزیر موصوف کو بھیجے اپنے مکتوب میں اس بات پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ نیا تعلیمی سیشن گرمی اپریل سے شروع ہو چکا ہے جب کہ ابھی تک اردو میڈیم کے طلبہ کی تمام کتابیں بازار میں موجود نہیں ہیں جس کی وجہ سے ان طلبہ کی تعلیم متاثر ہو رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ آخر این سی ای آر ٹی کر کیا رہی ہے؟ پرائمری سے سینئر سیکنڈری زمرے تک تمام نصابی کتابیں مہیا کرانا اس کی ذمہ داری ہے لیکن ہر سال اردو میڈیم کے طلبہ کو نصابی کتابوں کے لیے مہینوں انتظار کرنا پڑتا ہے اور این سی ای آر ٹی انھیں وقت پر کتابیں مہیا کرانے میں ناکام رہتی ہے۔

پروفیسر اختر الواسع نے وزیر موصوف کو بھیجے مکتوب میں حوالہ پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ابھی اردو میڈیم کی گیارہویں جماعت کی معاشیات، گیارہویں کی ہی سیاسیات، تاریخ عالم (ہسٹری)، بارھویں جماعت کی عصری دنیا کی سیاست اور تحریک ہند بارت-2 اور قواعد (گرامر) کی کتابیں طلبہ کو نہیں مل سکی ہیں جب کہ سیشن شروع ہوئے تقریباً چار ماہ گزر چکے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ حالاں کہ اردو میڈیم کی کتابوں کا معیار بہتر ہوا ہے لیکن جب یہ وقت پر ہی مہیا نہیں ہوتیں تو اس کا بھی کیا فائدہ؟ انھوں نے خط میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ وہ یہ خط اردو اکادمی کے وائس چیئرمین کی حیثیت سے لکھ رہے ہیں کیوں کہ اکادمی اردو میڈیم کی کتابوں کی تقسیم کار ہے۔

واضح ہو کہ یہ کوئی پہلا موقع نہیں ہے جب راجد حالی میں اردو میڈیم کے طلبہ کو نصابی کتابوں کے لیے پریشان ہونا پڑ رہا ہے۔ یہ دشواری ہر سال آتی ہے، بلکہ اب تو ایسا محسوس ہونے لگا ہے کہ اردو میڈیم کے طلبہ کو جان بوجھ کر پریشان کیا جاتا ہے، ورنہ کیا وجہ ہے کہ انگریزی اور ہندی میڈیم کے طلبہ کے لیے تمام نصابی کتابیں فروری مارچ میں ہی بازار میں آجاتی ہیں جب کہ اردو میڈیم کے طلبہ کو ہی کتابوں کے لیے اکتوبر نومبر تک انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر اختر الواسع کا کہنا ہے کہ یہ لسانی اقلیت کے تعلیم کے حق کے منافی بلکہ اس کی خلاف ورزی ہے۔ اس کے علاوہ کتابیں نہ ملنے کے سبب بچوں کی تعلیم پر جو منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ الگ ہے۔ انھوں نے کہا کہ اگر نیت صاف ہو اور کام کرنے کا جذبہ ہو تو یہی کتابیں وقت سے پہلے بھی آسکتی ہیں۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

ظہیرآباد میں ٹی ٹی سی اردو میڈیم کے قیام کے لیے پیش رفت

ظہیرآباد۔ پرنسپل سکریٹری پراسا مہاپترا نے ایک مکتوب ۱۲ رمئی کو کمشنر اینڈ ڈائرکٹر آف اسکول ایجوکیشن آندھراپردیش حیدرآباد کو روانہ کرتے ہوئے ہدایت دی ہے کہ وہ ضلع میدک کے ظہیرآباد میں ٹی ٹی سی کالج (اردو میڈیم) کے قیام کے لیے منصوبہ جاتی اخراجات اور درکار اساتذہ کی تعداد سے متعلق تجاویز روانہ کریں۔ اس خصوص میں ریاستی چیف منسٹر جناب کرن کمار ریڈی نے ۲۰۱۲ میں ظہیرآباد میں منعقدہ پرجا پتھم پروگرام میں شرکت کے موقع پر ڈاکٹر جے گیتا ریڈی (ریاستی وزیر بھاری صنعتیں) کی نمائندگی پر ٹی ٹی سی کالج کے قیام کا اعلان کیا تھا۔ اس خصوص میں آج یہاں کانگریس کے مسلم قائدین نے ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے مذکورہ ٹی ٹی سی کالج کے قیام کے سلسلے میں پیش رفت کو خوش آئند بتایا اور وزیر اعلا کرن کمار ریڈی اور ڈاکٹر گیتا ریڈی کا شکریہ ادا کیا۔ واضح رہے کہ ظہیرآباد کثیر اردو ذریعہ تعلیم کا علاقہ مانا جاتا ہے، یہاں کے طلبہ بالخصوص طالبات کو ٹی ٹی سی ٹریننگ کے لیے دور دراز مقامات کو جانا پڑتا تھا۔ مذکورہ کالج کے قیام سے سرپرستوں اور طلبہ و طالبات میں خوشی ہے۔

(انقلاب، حیدرآباد)

دہلی سرکار سے تعلیمی نظام اور ملازمت میں اردو کو لازمی قرار دینے کا مطالبہ

نئی دہلی (۲۸ رجولائی)۔ مسلم پالیٹکل جسٹس فورم کے صدر پروفیسر انور پاشا نے دہلی کی وزیر اعلا شیلا دکشت کو ایک میمورنڈم ارسال کرکے یہ مطالبہ کیا ہے کہ دہلی سرکار دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے اردو اور پنجابی کو دہلی کے نظام تعلیم میں کم از کم دسویں کلاس تک لازمی زبان کے طور پر شامل کرنے اور ریاستی سطح کی سرکاری ملازمتوں میں ہندی، انگریزی کے ساتھ اردو اور پنجابی میں سے کسی ایک زبان میں دسویں کلاس تک کی سند کو لازمی قرار دے، کیوں کہ ہر ریاست میں ریاستی سرکاری زبانوں کا علم اور اس کی سند ملازمت کے لیے لازمی ہے۔ پروفیسر پاشا نے دہلی یونیورسٹی کے نئے نظام تعلیم میں اردو کے اخراج کو دہلی کے اعلا تعلیمی نظام سے اردو کے اخراج کا آغاز بتایا اور اس بات پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے ریاستی سرکار سے اس سلسلے میں مداخلت کی اپیل کی۔ انھوں نے میمورنڈم کی ایک کاپی دہلی اسٹیٹ اقلیتی کمیشن کو بھی ارسال کی ہے۔ (راشٹریہ سہارا، دہلی)

بیسک اسکولوں میں 80 ہزار سے زائد بچے اردو کتابوں سے محروم

بچوں کو اردو کے نہیں بلکہ انگریزی اور ہندی کے ٹیچر پڑھا رہے ہیں

نور پور، بجنور (۱۵ راگست)۔ اترپردیش میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہونے کے باوجود بھی بیسک اسکولوں میں اردو کے بچوں کے ساتھ سوتیلا برتاؤ کیا جا رہا ہے۔ قابل ذکر ہے کہ اردو کے بچوں کو انگریزی کے ماسٹر اور ہندی کے ماسٹر تعلیم دیتے ہیں۔ ۲۰۱۲-۲۰۱۳ کا تعلیمی سال شروع ہوئے بھی تقریباً 35 دن گزر گئے ہیں، لیکن تقریباً سو سے زائد اسکولوں میں تقریباً 80 ہزار اردو کے بچوں کے پاس ابھی تک کتابیں بھی مہیا نہیں ہیں۔ پرائمری کے اسکولوں میں اردو تعلیم کا حال خدا بھروسے پر ہے۔ ریاستی حکومت تعلیم کے نام پر آئے دن کروڑوں روپے خرچ کرتی ہے لیکن اردو کے نام پر نہیں۔ ضلع بجنور میں سیکڑوں اسکول ایسے ہیں جن کے اندر اچھی خاصی تعداد اردو کے بچوں کی ہے لیکن ان اردو کے ماسٹر دیکھنے کو بھی نہیں ملتے ہیں۔ صدر جمہوریہ کے ہاتھوں اعزاز سے نوازے گئے ٹیچر سعادت حسین کا کہنا ہے کہ ضلع بجنور میں تقریباً ایک لاکھ بچے بیسک اسکولوں میں اردو پڑھتے آتے ہیں اور محکمہ تعلیم کے پاس تقریباً چودہ سو اردو ٹیچر بھی موجود ہیں لیکن بچوں کی بدقسمتی یہ ہے کہ بچوں کو اردو کے ماسٹر نہیں بلکہ انگریزی اور ہندی کے ماسٹر پڑھا رہے ہیں اور اگر کہیں پر اردو کا ماسٹر تعینات ہے تو وہاں پر اردو کے بچے موجود نہیں ہیں۔ اسی کے ساتھ ایک ماہ گزرنے پر بھی اردو کی کتابیں اسکولوں میں دستیاب نہیں ہوئی ہیں۔ ماسٹر سعادت حسین نے مزید بتایا کہ گزشتہ سال محمد پور، دیول بلاک میں اردو کی جگہ دوسری کتابیں تقسیم کی گئی تھیں۔ نورپور اشرف ذکریا اسلامیہ انٹر کالج کے پرنسپل شیر محمد انصاری نے بتایا کہ ہمارے کالج میں جونیئر کے درجات میں 250 بچوں کے پاس اردو ہے لیکن محکمہ تعلیم کی طرف سے ابھی تک اردو کی کتابیں دستیاب نہیں ہوئی ہیں، جس کی وجہ سے بچوں کی تعلیم کا کافی نقصان ہو رہا ہے، جب کہ کئی مرتبہ تعلیمی افسران سے اردو کی کتابوں کا مطالبہ کیا جا چکا ہے۔ (انقلاب، دہلی)

9 اردو بی ٹی سی ٹیچر تین برس سے تنخواہ سے محروم

گونڈہ، یوپی (۲ راگست)۔ ڈائٹ ورچی کنواں پر ٹریننگ کررہے اردو بی ٹی سی ٹیچروں کو تین سال سے تنخواہ نہیں ملی۔

اس کی شکایت ڈی ایم سے کی گئی ہے۔ ضلع میں صرف ۹ اردو بی ٹی سی ٹیچر کو چھوڑ کر ریاست کے سبھی اردو بی ٹی سی ٹیچروں کو تنخواہ دی جا چکی ہے۔ سال ۲۰۰۶ میں منتخب ہوئے مطیع اللہ، خلیق الرحمن خاں، قاضی انوار الحق، عبدالمبین، محمد حمید انصاری، محمد راشد، فرح کوثر، صائقہ انجم اور سعیدا خاتون کی پہلے بیچ میں ۲۷ رجون ۲۰۱۰ سے ٹریننگ شروع ہوئی۔ ۲۷ رجون ۲۰۱۲ کو دو سال پورا ہو گیا، دو سال کے دوران ایک بھی ماہ کی تنخواہ نہیں دی گئی جس سے ٹیچروں کی حالت پریشان کن ہے۔ حالت یہ ہے کہ ڈائٹ کے پرنسپل کو اس کا علم ہی

اردو ٹیچرس کی اسامیوں پر تقررات کیے جائیں

حیدرآباد۔ صدر پردیش کانگریس اقلیتی ڈپارٹمنٹ محمد سراج الدین نے ریاستی وزیر تعلیم پارتھا سارتھی سے ملاقات کی اور ریاست کے مختلف اضلاع کے سرکاری مدارس میں اردو ٹیچرس کی خالی اسامیوں پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے جلد از جلد تقررات کو یقینی بنانے پر زور دیا۔ انھوں نے ضلع سطح پر اردو ٹیچرس کی خالی اسامیوں کی فہرست پیش کی۔ اس موقعے پر کانگریس قائدین میر ہادی علی اور مسٹر مختار بھی موجود تھے۔ انھوں نے کہا کہ ریاستی حکومت جاریہ سال ڈی ایس سی کے ذریعے تیس ہزار ٹیچرس کے تقررات کا منصوبہ رکھتی ہے، تاہم اردو والوں کو شکایت ہے کہ حکومت اردو کے ساتھ انصاف نہیں کررہی ہے بلکہ اردو ٹیچرس کے انتخاب میں سوتیلا سلوک کیا جارہا ہے۔ اس طرح کا رجحان کانگریس حکومت کے لیے نقصان دہ ہے۔ انھوں نے ریاستی وزیر تعلیم کو یادداشت پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ ٹیچرس کے تقررات کا نوٹیفکیشن جاری کرنے سے قبل ریاست کے تمام اضلاع کے ڈی ای او سے اردو ٹیچرس کی خالی اسامیوں کے علاوہ پس ماندہ طبقات کے لیے مختص اسامیوں کی فہرست طلب کریں، جن پر امیدواروں کی عدم دستیابی سے تقررات رکے ہوئے ہیں اور ایسی اسامیوں کو عام زمرے میں تبدیل کرتے ہوئے تقررات عمل میں لائیں۔ ریاستی وزیر تعلیم نے جناب سراج الدین کو یقین دلایا کہ حکومت اردو کے ساتھ انصاف کرے گی اور جن اضلاع میں اردو ٹیچرس کی اسامیاں ہیں خالی انھیں تقررات کے عمل میں شامل کرے گی۔ انھوں نے کہا کہ جہاں تک اردو میڈیم کی پس ماندہ طبقات کے لیے مختص اسامیوں کا سوال ہے، حکومت تین ڈی ایس سی تقررات تک انتظار کررہی ہے۔ ان خالی اسامیوں پر امیدوار دستیاب نہ ہونے کی صورت میں انھیں عام زمرے میں تبدیل کیا جائے گا۔ علاوہ ازیں ضرورت پڑنے پر ودیا والنٹیرس کی خدمات سے بھی استفادہ کیا جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ ٹیچرس کے تقررات سے قبل محکمہ تعلیم کے اعلا عہدیداروں کا اجلاس طلب کرکے انھیں ہدایت دی جائے گی کہ وہ اردو ٹیچرس کے تقررات پر خصوصی توجہ دیں اور خالی اسامیوں کی فہرست پیش کریں۔

(سیاست۔ حیدرآباد)

ڈگری کالج تانڈور (اردو میڈیم) میں ریگولر لیکچررس کے تقرر کا مطالبہ

حیدرآباد (۲۱ جولائی)۔ بیرسٹر اسدالدین اویسی (ایم پی) کی ہدایت پر جناب سید الطاف حیدر رضوی (ایم ایل سی) نے کمشنر کالجیٹ ایجوکیشن محکمہ اعلا تعلیم سے تحریری نمائندگی کی کہ گورنمنٹ ڈگری کالج تانڈور (اردو میڈیم) ضلع رنگا ریڈی میں ریگولر لیکچررس کے تقرر اور انفراسٹرکچر کی فراہمی کی جائے۔ انھوں نے نشان دہی کی کہ حکومت نے تعلیمی سال ۱۱-۲۰۱۰ سے بی کام اردو میڈیم کورس متعارف کرایا ہے لیکن تاحال باقاعدہ لیکچررس کا تقرر نہیں کیا گیا جس کی وجہ سے طلبہ کو تعلیم میں مشکلات کا سامنا ہے۔ اس سلسلے میں صدر تعلیمی کمیٹی تانڈور جناب محمد خواجہ میاں نے لیکچررس نہ ہونے سے تعلیم متاثر ہونے سے واقف کروایا جس پر جناب الطاف حیدر رضوی نے کمشنر کالجیٹ ایجوکیشن پر زور دیا کہ وہ گورنمنٹ ڈگری کالج تانڈور میں بی کام کے لیے ریگولر لیکچررس اور مناسب اسٹاف کے تقرر کے لیے متعلقہ حکام کو فوری ہدایات جاری کریں۔

(اعتماد۔ حیدرآباد)

نہیں۔ جب ان سے بات کی گئی تو انھوں نے کہا کہ جو بھی تھا ہم نے لسٹ بھیج دی ہے۔ 766 ٹیچروں کو تنخواہ بھی مل رہی ہے لیکن 9 ٹیچروں کا نام کیسے چھوٹ گیا دیکھنا ہوگا۔ پرنسپل اکاؤنٹ ٹیچروں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پر دوڑا رہے ہیں، اکاؤنٹ افسر ملک رام ورما کا کہنا ہے کہ ہمارے پاس جو بھی لسٹ آئی تھی سبھی کو تنخواہ دے دی گئی ہے۔ اس مد میں جب کی ایک کروڑ چودہ لاکھ کوٹے ہزار ہی دیا گیا ہے، 3 کروڑ 13 لاکھ 78 ہزار 131 روپیہ ریاستی حکومت کو واپس کردیا گیا ہے۔ ایسا بھی نہیں کہ حکومت نے بجٹ نہ دیا ہو ضابطے کے مطابق صرف اقلیتوں کو پریشان کرنے کے لیے انھیں دوڑایا جارہا ہے۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

اردو تعلیمی کمیٹی کے وفد کی آندھرا پردیش کے چیف منسٹر سے نمائندگی

حیدرآباد (۲۱ جولائی)۔ چیف منسٹر این کرن کمار ریڈی نے مولانا ابوالکلام آزاد کی یوم پیدائش (۱۱ نومبر) کے موقعے پر منائے جانے والے قومی یوم تعلیم کے علاوہ ریاستی سطح پر یوم اقلیت موثر طور پر منانے کا اعلان کیا ہے۔ کل ہند اردو تعلیمی کمیٹی کے ایک وفد نے کمیٹی کے صدر محمد جلیل پاشاہ کی قیادت میں چیف منسٹر سے ملاقات کی تھی۔ اس موقعے پر چیف منسٹر کو ایک یادداشت پیش کی گئی جس میں ۱۱ نومبر کو عالمی اردو کانفرنس کا اہتمام کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ وفد نے بعد ازاں چیف سکریٹری پی کے مہانتی سے ملاقات کی۔ چیف سکریٹری نے مولانا آزاد کی یوم پیدائش کی سرکاری طور پر تقاریب کے اہتمام کے لیے ضلع کلکٹرس اور سکریٹری محکمۂ اقلیت کو ضروری ہدایتیں جاری کیں۔

(اعتماد۔ حیدرآباد)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی رحلت پر اردو گھر میں تعزیتی جلسہ



نئی دہلی (۵ اگست)۔ اردو کے ممتاز اسکالر، ادیب اور دانش ور ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا ۳ اگست ۲۰۱۳ کو کراچی (پاکستان) میں انتقال ہوگیا۔ وہ ۸۷ برس کے تھے۔ ان کی وفات پر آج انجمن ترقی اردو (ہند) کے مرکزی دفتر اردو گھر میں انجمن کے صدر پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی کی صدارت میں ایک تعزیتی نشست منعقد ہوئی، جس میں سب سے پہلے انجمن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی نے خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے بتایا کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری ۲۶ جنوری ۱۹۲۶ کو فتح پور (اترپردیش) میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم فتح پور سے ہی حاصل کی۔ ۱۹۴۸ میں الہ آباد سے انٹرمیڈیٹ کیا اور پھر ۱۹۵۰ میں آگرہ یونی ورسٹی سے گریجویشن کرنے کے بعد وہ پاکستان ہجرت کرگئے تھے اور کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی۔ بعد میں انھوں نے کراچی یونی ورسٹی سے ایم اے اور ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ وہ پہلے ایسے پاکستانی اسکالر تھے جنھیں ۱۹۷۴ میں ڈی لٹ (اردو) کی ڈگری سے سرفراز کیا گیا۔ ڈاکٹر فاروقی نے کہا کہ فرمان فتح پوری صاحب مختلف موضوعات پر پچاس سے زیادہ کتابوں کے مصنف اور مرتب تھے۔ ان کے انتقال سے ہم صف اول کے ایک ادیب، محقق اور نقاد سے محروم ہوگئے ہیں۔

جناب شاہد ماہلی نے کہا کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری ممتاز نقاد اور دانش ور تھے۔ انھوں نے نیاز فتح پوری کی وراثت کو اعلا مقام پر پہنچایا۔ پاکستان جانے کے بعد انھوں نے رسالہ 'نگار' کو جاری رکھا۔ ان کے انتقال سے جو خلا پیدا ہوا ہے اسے پورا کرنا بہت مشکل ہے۔ وہ غالب انسٹی ٹیوٹ کے مختلف سیمیناروں میں بھی تشریف لائے اور انھوں نے یہاں اپنے مقالے بھی پیش کیے۔ دعا ہے کہ خدا ان کی مغفرت کرے اور ان کے لواحقین کو صبر عطا کرے۔

ڈاکٹر اسلم پرویز نے کہا کہ فرمان فتح پوری صاحب سے میری پہلی ملاقات خلیق انجم صاحب کے گھر پر اس وقت ہوئی جب وہ اور مشفق خواجہ صاحب ۱۹۸۰ کے دہے کے ابتدائی برسوں میں دہلی تشریف لاتے تھے۔ فرمان فتح پوری صاحب کا علم اور ان کی ادبی لیاقت تو سامنے کی چیزیں ہیں لیکن وہ بلا کے خورد نواز بھی تھے۔ وہ جتنے عرصے دہلی میں رہے ان کا سلوک ہمارے ساتھ انتہائی مشفقانہ رہا یہاں تک کہ انھوں نے مجھے ۱۹۸۹ میں کراچی میں نیاز فتح پوری پر منعقد ہونے والے سالانہ جلسے میں خصوصی لیکچر کی دعوت دی۔ کراچی میں باوجود اس کے کہ وہ ہمارے بزرگ تھے، میں نے ان کی مہمان نوازی کو اوج کمال پر پایا۔ ایسے لوگ روز روز نہیں پیدا ہوتے۔ ان کے بارے میں بہت کچھ کہا جاسکتا ہے لیکن جتنا بھی کہا جائے کم ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم جو اس تعزیتی نشست میں شامل ہونے سے قاصر تھے، انھوں نے اس تعزیتی نشست میں بذریعہ فون خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ میں عمر کے اعتبار سے خود کو فرمان فتح پوری صاحب کے خوردوں میں شمار کرتا ہوں لیکن وہ میرے انتہائی مشفق اور مہربان تھے کہ دہلی ہو یا کراچی وہ میری پذیرائی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے تھے۔ انھوں نے بڑے بڑے علمی کام بھی کیے۔ انھوں نے نیاز فتح پوری کے رسالے 'نگار' کو مرتے دم تک زندہ رکھا اور وہ ان کی یاد کو ہمیشہ گلے سے لگائے رہے۔ وہ مجسم خلوص تھے اور ان کے خلوص میں کہیں بھی کسی قسم کی دنیا داری کا شائبہ نہیں تھا۔ ان کے انتقال کی خبر میرے لیے ایک بہت بڑا ذاتی غم ہے جسے میں الفاظ میں بیان نہیں کرسکتا۔ بس میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

جناب سید شریف الحسن نقوی نے اظہار تعزیت کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری زندگی بھر علم و ادب کی آبیاری کرتے رہے۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر اہم کتابیں لکھیں۔ بلاشبہ ان کے انتقال سے علم و ادب کی دنیا میں ایسا خلا پیدا ہوا ہے جسے آسانی سے پُر نہیں کیا جاسکتا۔

پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ فرمان فتح پوری کو بہ حیثیت ادیب اور نقاد اردو دنیا میں ایک اعلا مقام حاصل تھا۔ انھوں نے نیاز فتح پوری کی روایت اور اقدار کو مرتے دم تک زندہ رکھا۔ پاکستان جانے کے بعد انھوں نے نیاز فتح پوری کے رسالے 'نگار' کو جاری رکھا۔ فرمان فتح پوری صاحب ادیبوں اور شاعروں کے بڑے قدرداں تھے۔ انھوں نے ہندستان اور ہندستان کے ادیبوں اور شاعروں سے اپنے تعلقات ہمیشہ استوار رکھے۔ انھیں ہندستان اور پاکستان دونوں ملکوں کے ادبی حلقوں میں یکساں عزت اور احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ آج ان کے انتقال پر پوری اردو دنیا سوگوار ہے۔

☆☆☆

اردو کے ساتھ ایک بار پھر ناانصافی

اردو کو چھوڑ کر تمام مضامین کی کتابیں طلبہ کو تقسیم، اردو کتب کی طباعت کا آرڈر بھی نہیں

فیروزآباد، یوپی (۲۴ جولائی)۔ کاشی اردو مرکز کے ارکان کی ایک نشست حالی پبلک اسکول پر منعقد ہوئی جس میں انتظامیہ کی جانب سے اردو کے ساتھ کی جارہی ناانصافی کی سخت مذمت

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : پانی سے مانجھی تک
(تنقید کے آئینے میں)
مصنف : شگفتہ یاسمین
ضخامت : ۱۴۴ صفحات
قیمت : ۲۰۰ روپے
ملنے کا پتا : براؤن بک پبلی کیشنز
N-139C فرسٹ فلور
ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر
اوکھلا، نئی دہلی 110025
تبصرہ نگار : دیپک بدکی
deepak.budki@gmail.com

غضنفر موجودہ دور کے اہم ناول نگار، افسانہ نگار، ڈرامہ نگار اور شاعر ہیں جن کے کئی ناول منصۂ شہود پر آچکے ہیں جیسے پانی، کینچلی، کہانی انکل، دویہ بانی، فسوں، وش منتھن، مم، شوراب اور مانجھی۔ زیر نظر کتاب کی مصنفہ شگفتہ یاسمین جن کی دل چسپی اردو فکشن کے ساتھ مسلّم ہے، غضنفر کے ناولوں سے بے حد متاثر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے غضنفر کے ناولوں کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ موصوفہ 'اردو ناول کی تنقید کا تجزیاتی مطالعہ' لکھ کر جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے پہلے ہی ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرچکی ہیں، آج کل آل انڈیا ریڈیو، دوردرشن اور زی سلام سے وابستہ ہیں۔

بقول تنقید نگار غضنفر کی ناولوں میں اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہ تمثیلوں، علامتوں اور استعاروں کا استعمال کرتے ہیں۔ ان کا "فن پیچیدہ اور غیر روایتی ہے۔ اپنے ہر ناول میں نئی اور تجرباتی زمین تلاش کرنے کی کوشش ہے"۔

غضنفر کا ۱۹۸۹ میں شائع ہوا پہلا ناول 'پانی' ہے جس کے بارے میں ناول نگار کا خیال ہے کہ اسے آج تک کوئی سمجھ نہیں سکا۔ علامتوں میں ملفوف اور داستانوی رنگ میں پیش کیا گیا یہ ناول انسان کی ازلی جبلت 'پیاس' کو منعکس کرتا ہے۔ 'کینچلی' مرد اور عورت کی نفسیاتی کشمکش اور ان کے آپسی رشتوں کو نئی نظر سے دیکھنے کی کوشش ہے۔ ناول 'دویہ بانی' میں غضنفر نے دلتوں کے مسائل اور ان کی شناخت کے بارے میں کئی سوال کھڑے کیے ہیں جن سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ 'فسوں' میں، جس کو شگفتہ یاسمین ان کا بہترین ناول قرار دیتی ہیں، چند نوجوان اتوپیا (Utopia) کے خواب دیکھ کر زندگی کی حقیقت سے دوچار ہوتے ہیں۔ ناول 'شوراب' مادیت پرست، شکست و ریخت سے جوجھتی موجودہ زندگی کی داستان ہے جس میں 'مشیا' کی دخلِ نسوانیت خودغرضی، نفس پرستی اور ہوس پرستی کی بلی چڑھائی جاتی ہے۔ البتہ نقاد کو اس ناول میں جنسیت کا غلبہ نظر آتا ہے۔ 'وش منتھن' بابری مسجد کے پس منظر میں لکھا ہوا ناول ہے جو مسلمانوں کے قومی تشخص پر فوکس کرتا ہے۔ 'مم' جو 'وش منتھن' کے بعد شائع ہوئی، میں شاعرانہ انداز بیان استعمال کیا گیا ہے جو بقول نقاد فنکار کی مجبوری اور شعبدہ بازی کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ 'مانجھی' میں ناول نگار نے بہت سے سماجی مسائل، عالمی ریشہ دوانیوں، مذہبی توہم پرستی اور تہذیبی اقدار کے زوال پر سے پردہ اٹھایا ہے البتہ اس ناول میں بقول نقاد بنیادی جزئیات مفقود ہیں۔ نہ الجھاؤ ہے، نہ کشمکش، نہ پیچیدگیاں اور نہ نقطۂ عروج، بس ابتدا، واقعات، مناظر اور چھوٹی بڑی کہانیوں کا سلسلہ۔ زبان ہندیائی ہے جو ہمیشہ موضوع بحث رہی ہے۔

عورت کے تصور کے حوالے سے تنقید نگار رقم طراز ہیں کہ "بیشتر ناولوں میں انھوں نے خواتین کی ترجمانی بھی کی ہے۔ جذبات کی بھٹی میں سلگ رہے ان کے گونگوں احساسات کو آواز دی ہے۔ کبھی عورت کے خوابیدہ پندار کو متحرک دیا ہے، کبھی جھنجھوڑا ہے اور کبھی برملا احتجاج و بغاوت پر مجبور کیا ہے... 'پانی' سے لے کر 'شوراب' تک پیکر نسواں کے نشیب و فراز کا تذکرہ تو ان کے ناولوں میں ملتا ہے۔ خواہ وہ 'دویہ بانی' کی دلت لڑکی بندیا ہو یا 'شوراب' کی ایئر ہوسٹس یا پھر شاداب کی بیوی فردوس۔

کتاب کے آخر میں غضنفر سے تنقید نگار کا ایک مکالمہ بھی ہے جو غضنفر کی شخصیت اور نظریے کے کئی پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے، مثلاً: (۱) وہ ناول کو اس لیے ترجیح دیتے ہیں کیوں کہ ناول کا کینوس بہت بڑا ہے جس میں زندگی کی رنگارنگی اور قوت متخیلہ دکھینے دونوں کو اڑان بھرنے کا خوب مزہ ملتا ہے۔ (۲) اردو میں جتنے بڑے ناول لکھے گئے ہیں تقریباً سبھی کا محور ہندوستان ہے۔ (۳) ماضی میں ناول نگاروں کے موضوعات محدود تھے، ناول تفصیل کے ساتھ لکھے جاتے تھے اور زبان میں زیادہ رچاؤ ہوتا تھا جب کہ موجودہ ناول نگاروں کے یہاں موضوعاتی بوقلمونی ہے، ایجاز و اختصار ہے مگر زبان کا وہ رچاؤ نہیں ہے۔ (۴) غضنفر ترقی پسندی، جدیدیت یا مابعد جدیدیت تینوں میں سے خود کو کسی کے قریب نہیں پاتے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو شگفتہ یاسمین کی تاثراتی تنقید میں معروضیت ہے اور کسی قسم کی بناوٹ نہیں دکھائی دیتی۔ وہ غضنفر کے ناولوں سے متاثر ہونے کے باوجود ان میں پائی گئی کوتاہیوں کو نظر انداز نہیں کرتیں۔ یہ کتاب اردو ادب میں گراں قدر اضافہ ہے اور غضنفر کے ناولوں کو سمجھنے کے لیے سنجیدہ قاری کو اس سے بہت مدد مل سکتی ہے۔

●●●

نام کتاب : تعبیر و تاویل
(تنقیدی مضامین)
مصنف : محمد شاہد پٹھان
ضخامت : ۲۹۸ صفحات
قیمت : ۴۰۰ روپے
ملنے کا پتا : ہادی منزل، کاسیلا اسٹریٹ
ایم ڈی روڈ، جے پور
تبصرہ نگار : ڈاکٹر سید معصوم رضا عشروی
razakidak@gmail.com

'تعبیر و تاویل' محمد شاہد پٹھان کے تنقیدی مضامین کا دوسرا مجموعہ ہے جس میں گاہے بہ گاہے لکھے گئے تنقیدی و تاثراتی مضامین شامل ہیں جن کی تعداد ۹ ہے۔ پہلا مضمون 'شبلی نعمانی کے تنقیدی تصورات' جو 'نیا دور' لکھنؤ میں جولائی ۲۰۰۳ میں شائع ہوا تھا۔ دوسرا مضمون محی الدین قادری زور کی تنقید نگاری ہے جو جون ۲۰۰۲ میں 'فکر و تحقیق' میں شائع ہو چکا ہے۔ تیسرا مضمون 'راجستھان میں جدید غزل کا ارتقا' ہے جو ۲۰۰۳ میں 'فکر و تحقیق' میں شائع ہو چکا ہے جس میں راجستھان میں شاعری کے حوالے سے سرسری ذکر ہے لیکن چند حضرات کا تذکرہ قدرے تفصیل سے موجود ہے جس میں مفتون ٹونکی، محمد عثمان عارف، غوث شریف عارف، خوشتر کرانوی، خورشید احمد سحر، خداداد مونس، محشر عباسی، منصور چوروی، سید فضل المتین، میکش اجمیری، مخمور سعیدی، عقیل شاداب، ظفر غوری، ظفر احمد پرواز، عابد ادیب، امین چودھری، خلیل تنویر، شاہد عزیز، احتشام اختر، جمیل قریشی، ممتاز راشد، غضنفر صدیقی، عشرت دھولپوری، رش۔ک۔ نظام، اظہار مسرت، شاہد میر، نذیر فتح پوری، انعام شرر ایوبی، ڈاکٹر سعادت فہیم، ابرار احمد فائق، فراز حامدی، الطیف تہمی، ڈاکٹر فاروق بخشی، ڈاکٹر پریم بھنڈاری، ڈاکٹر عبدالحمید، عارف محمد خاں، کامران نجمی، عبدالشکور انور، یوسف راز، سرفراز شاکر، فاروق انجینئر وغیرہ کے حوالے سے راجستھان میں جدید غزل کے درخشاں ستاروں کا ذکر موجود ہے۔ چوتھا مضمون گوپی چند نارنگ 'پرزنگ' کے نمبر سے متعلق ہے۔ پانچواں مضمون 'اکبر جے پوری کی نظم نگاری' ہے جو ۲۰۰۰ میں 'فکر و تحقیق' میں شائع ہو چکا ہے۔ چھٹا مضمون 'ناظم سنبھلی: احوال و افکار' ہے جس میں ناظم سنبھلی کی غزلیہ شاعری اور رباعیات وغیرہ کے ساتھ ساتھ نظموں کے حوالے سے بحث کی گئی ہے۔ ساتواں مضمون 'چندر بھان خیال اور صبح مشرق کی اذان' میں چندر بھان خیال کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے ان کے تیسرے شعری مجموعے 'صبح مشرق کی اذان' کے حوالے سے قدرے تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ آٹھواں مضمون 'عقیل شاداب: احوال و افکار' ہے جس میں عقیل شاداب کے دو شعری مجموعے 'بے آب سمندر' اور 'آدمی تھا' کے ساتھ ساتھ ان کے ادبی کارنامے، ادبی سرگرمیوں اور تفصیلی کوائف پر بحث ہے۔ نواں اور آخری مضمون 'ڈاکٹر شاہد میر: ایک شاعر خوش گفتار' ہے جس میں شاہد میر کے تینوں شعری مجموعے 'موسم زرد گلابوں کا'، 'مسافر بے' اور 'ریگ رواں' کے حوالے سے ان کی شخصیت اور فن پر تفصیلی مضمون ہے جو سہ ماہی 'انتساب' جون ۲۰۱۱ میں شائع ہو چکا ہے۔

مختصراً یہی کہا جاسکتا ہے کہ محمد شاہد پٹھان نے موتی کے بکھرے ہوئے دانے کو ایک مالا کی شکل میں پرو کر اردو کے تنقیدی ادب میں ایک بیش قیمتی اضافہ کیا ہے۔ اس کتاب کو دستاویزی حیثیت حاصل ہے جس کی خاص وجہ یہ ہے کہ اس میں صوبہ راجستھان کے اردو شعرا کا جس تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے وہ بلاشبہ قابل ستائش ہے اور محمد شاہد پٹھان صاحب قابل مبارک باد ہیں جنھوں نے تذکرہ اور تنقید کے چراغ روشن کیے ہیں۔ امید کہ کتاب کی ادبی حلقوں میں ستائش کی جائے گی۔

●●●

نام کتاب : نشاطِ سخن (مجموعۂ کلام)
مصنف : شفیق احمد خاں کوثر
ضخامت : ۱۳۱ صفحات
قیمت : ۱۵۰ روپے
ملنے کا پتا : ڈیرہ کمال زئی، چوکی پاکھڑ
رام پور 244490 (یوپی)
تبصرہ نگار : ایم رحمٰن (دہلی)
mrahmandelhi@yahoo.com

کتاب کے صفحہ اول پر 'نشاطِ سخن' لکھ کر ایک شعر یوں درج ہے:

جب ہوا مجھ سے ارتباطِ سخن
ہر غزل بن گئی نشاطِ سخن

زیر تبصرہ کتاب غزلوں کا مجموعہ ہے، جس کے مصنف شاعر اور ادیب شفیق احمد خاں کوثر کمال زئی ہیں۔ کتاب پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ شاعر کے متعلق یہ کہا گیا 'گمنام ہے کوئی' اور جب شاعر یا ادیب

شانِ اردو

کتنی میٹھی زبان ہے اردو
بولیوں میں مہان ہے اردو
یہ فضاؤں کو پل میں مہکا دے
جیسے مُرلی کی تان ہے اردو
اس کو بولے 'ولی' وہ بن جائے
دو ہے، غزلوں کی جان ہے اردو
جو سنے وہ مرید ہو جائے
ایسی جادو بیان ہے اردو
اس میں گنگا بھی اور جمنا بھی
گو ہمالہ کی آن ہے اردو
ساری دنیا ہے اس کی دیوانی
میرے بھارت کی شان ہے اردو
اس کے کلیات اور مسدس ہیں
اور کہیں پر 'گلگان' ہے اردو
رنگ، خوشبو، شباب، ناز و ادا
سر سے پا گلستان ہے اردو

طیب پاشاہ شباب (ایوت محل)

گمنامی کی اذیت جھیلتا ہے تو درد نہاں ہوتا ہے۔ مزاجاً موصوف نے ہمیشہ ہجوم کی دنیا سے فاصلہ قائم رکھا، مگر وہ چپ چاپ اپنی شعری کائنات کو آباد کرتے رہے جس کا نتیجہ 'نشاطِ سخن' کے روپ میں آیا۔ موصوف نیک اور شریف النفس طبیعت کے حامل ہیں۔ علامہ ابر احسنی گنوری کے جانشین شوق اثر رامپوری سے انھیں تلمذ کا شرف حاصل ہے۔ غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

تیرے دل کو جو سکوں دے وہ دوا کہاں سے لاؤں
جو مٹا دے غم کی ظلمت وہ ضیا کہاں سے لاؤں
مری آنکھ سے اتر کر مرے دل میں بسنے والے
ترے غم کی تاب لاؤں تو بتا کہاں سے لاؤں
تری ہر جفا پہ ظالم میں لٹا چکا وفائیں
ترے واسطے اب میں وفا کہاں سے لاؤں

قطعہ ملاحظہ کیجیے:

یہ مانا مفلس و نادار ہوں میں اے وطن دشمن
نگاہوں میں تری بیکار ہوں میں اے وطن دشمن
ابھی سمجھا نہیں تو جذبۂ حب وطن کیا ہے
مٹانے کو تجھے تیار ہوں میں اے وطن دشمن

شوکت علی خاں ایڈوکیٹ (رامپور) 'نشاطِ سخن' میں ایک جگہ رقم طراز ہیں:

''شفیق احمد خاں کوثر انتہائی وضع دار اور صاف گو انسان ہیں۔ وضعداری اور دلآویزی سے ان کی شخصیت معمور ہے، اس لیے اگر کسی سچے اور اچھے شاعر کو ادب میں روا خرافات سے مایوسی ہاتھ لگتی ہے تو اس میں کوئی تعجب نہیں کہ گوشہ میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے۔ ان کے کلاموں کو قابل قدر سمجھتا ہوں''۔

روزنامہ 'ناظم' رامپور کے ایڈیٹر جناب ناظم علی خاں لکھتے ہیں کہ ''زیادہ تر غزلوں میں 'نشاطِ سخن' لفظ کا استعمال اور پھر مجموعے کا نام 'نشاطِ سخن' کا ہونا جوانی کی کسی محبت کی مسرت کا اشارہ کرتی ہے''۔

مجموعۂ کلام 'نشاطِ سخن' کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ کوثر رامپوری کی شاعری بہت صاف اور ہموار شاعری ہے۔ اس میں پیچیدگی نہیں ہے۔ انھیں شاعری کہنے کا عمدہ ہنر ہے اور اس کے وسیلے سے وہ اپنے احساسات جس طریقے سے پیش کرتے ہیں اس پر خوش ہونا چاہیے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو زیر نظر مجموعہ شاعری کی فعال زندگی کا ثمرہ ہے جس میں غم جاناں پر بجائے آنسو بھی ملتے ہیں اور غم دوراں پر لکھے تو ہے بھی۔ یہی رجائیت ان کے روشن مستقبل کی ضامن ہے۔ امید کہ شاعری کے شناساؤں کی جانب سے یہ مجموعہ پذیرائی حاصل کرے گا۔

●●●

بقیہ: شاعرانہ نوک جھونک

صفحہ ۸ سے آگے

بادشاہ وقت بہادر شاہ ظفر کی خدمت میں سارا ماجرا سنایا۔ ایک مرتبہ جب مرزا غالب بھی موجود تھے اور استاد ذوق بھی موجود تھے، بہادر شاہ ظفر نے غالب سے اس واقعے کے تعلق سے دریافت کیا۔ غالب بذلہ سنجی اور ظرافت کے صرف ماہر نہیں بلکہ بلا کے حاضر جواب بھی تھے۔ انھوں نے یہ شعر کہا:

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

غالب اور ذوق کے درمیان اکثر چشمکیں ہوتی رہتی تھیں۔ بہادر شاہ ظفر کے صاحبزادے کے عقد کے موقعے پر مرزا غالب نے سہرا لکھا تھا۔ ان کے شاگردوں نے استاد ذوق پر طنز کرتے ہوئے کہا تھا:

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بہتر سہرا

استاد ذوق نے جواباً فرمایا تھا:

جس کو دعویٰ ہے سخن کا یہ سنا دے اس کو
دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخن ور سہرا

●●●

بقیہ صفحہ ۵ سے آگے

کی گئی۔ مرکز کے رکن سید عظمیٰ جمیل نے کہا کہ انتظامیہ کی جانب سے اردو کے ساتھ سوتیلا رویہ ایک بار پھر سامنے آیا ہے۔ تعلیمی سیشن شروع ہوئے تقریباً ایک ماہ گزر چکا ہے، تمام مضامین کی کتب نہ صرف یہ کہ بی آر سی اور اسکولوں تک پہنچ چکی ہیں بلکہ طلبہ کو تقسیم بھی کی جا چکی ہیں جب کہ اردو کی کتب طلبہ کو ملنا تو دور ابھی ان کا اسکولوں و بی آر سی تک پہنچ دور دور تک پتا نہیں ہے۔ اس بابت جب کانتی اردو مرکز کے اراکین نے افسران سے جاننے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ پہلے، دوسرے اور تیسرے درجے کی سنسکرت، آرٹ، حساب و دیگر مضامین کی کتابوں کا آرڈر برہما پرنٹنگ پریس متھرا کو دیا گیا تھا، جس نے قبل از وقت سو فیصد کتب فراہم کردیں جو طلبہ کو وقت پر تقسیم بھی کردی گئیں۔ انہی مضامین کی درجہ چار اور پانچ کی کتب کا آرڈر راوت پرکاشن، ہاتھرس کو دیا گیا، اس نے بھی ان کتب کی سو فیصد فراہمی کردی ہے۔ اسی طرح درجہ چھ، سات اور آٹھ کی کتب کی فراہمی بھی برہما پرنٹنگ پریس نے سو فیصد کرادی ہے لیکن جب اردو کی کتب کے بارے میں جاننے کی کوشش کی گئی تو یہی پتا چل سکا کہ ان کتب کا آرڈر کسی پبلشر کو دیا گیا ہے، البتہ یہ ضرور پتا چل سکا کہ اردو کی کتب کی فراہمی ابھی صفر فیصد ہوئی ہے۔ ایک بات اور قابل غور ہے کہ دیگر مضامین کی کتب کی جو فراہمی کرائی گئی ہے ان میں سے ہر مضمون کی کتب کی تعداد 30 سے 40 ہزار کے درمیان ہے، جب کہ اردو کی کتب جو کسی نامعلوم پبلشر کو فراہم کرانی ہیں، ان کی تعداد کسی کتاب کی تین سو ہے تو کسی کی آٹھ سو، گویا کہ کوئی کتاب ہزار کی تعداد میں بھی نہیں چھپ رہی ہے، تب بھی ابھی تک ان کی فراہمی نہیں کرائی جا سکی ہے۔ درجہ ایک سے پانچ تک کی اردو کی کتب کل 2642 کی طباعت کی جانی ہے، جب کہ درجہ چھ سے آٹھ تک کی صرف 747 کتب ہی کی طباعت کی جانی ہے۔ حاجی مرزا اخلاق بیگ نے بتایا کہ بیسک تعلیم کے نگراں واسو دیو کے ۱۷؍جون ۲۰۱۳ کے ایک خط سے یہ جانکاری ملتی ہے کہ اقلیتی بہبود کے وزیر اعظم خاں نے اردو کی کتب کی نئے سرے سے نظر ثانی کرکے طباعت کرائے جانے کے احکام جاری کیے ہیں، اس سے معلوم یہ ہوا کہ جون کے آخر تک تو اردو کتب کی طباعت کے آرڈر ہی نہیں دیے گئے تھے۔

(انقلاب۔ دہلی)

◆◆◆◆◆

انجمن ترقی اردو (ہند) کی چند مطبوعات

پہلا ورق (سہ ماہی اردو ادب کے منتخب اداریے) اسلم پرویز		
انتخاب وترتیب: شمس الحق عثمانی، محمد فیروز دہلوی		۳۰۰/=
راس مسعود	حکیم سید ظل الرحمن	۲۵۰/=
نامکمل	اطہر فاروقی	۲۲۰/=
سیرت فریدیہ (سرسید کے نانا خواجہ فریدالدین احمد خاں اور دیگر افراد خاندان کے حالات)		
مصنف: سرسید احمد خاں، مرتب: خلیق انجم		۱۵۰/=
ہندستان میں اردو سیاست کی تنظیم نو	اطہر فاروقی	۲۶۰/=
انقلاب: ایک تاریخ، ایک تہذیب کی کہانی	عابد اللہ غازی	۸۵/=
بلیک کال (داستانوی آموزگی پنجابی طویل ڈراما)	ڈاکٹر مظفرالدین فاروقی	۱۲۰/=
دوکان شیشہ گراں (کتابیں اور لوگ)	شمیم حنفی	۲۰۰/=
دلی کے محاورے	سید ضمیر حسن دہلوی	۱۰۰/=
مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا	خلیق انجم	۲۳۰/=
سن ستاون کی دلی اور بہادر شاہ ظفر	اسلم پرویز	۱۵۰/=
آزاد ہندستان میں اردو زبان تعلیم اور صحافت	اطہر فاروقی	۱۷۰/=
ہندستان میں فکری وتہذیبی اصلاح کا آغاز اور ماسٹر رام چندر		
	صدیق الرحمٰن قدوائی	۱۸۰/=
The Court of Indar [اندر سبھا] (سید آغا حسن امانت)		
	افروز تاج	۳۰۰/=
اردو ہے جس کا نام (رباعیات کا مجموعہ)	امیر چند بہار	۱۱۰/=
پریم چند گھر میں (شورانی دیوی)	مترجم: سید حسن منظر	۴۰۰/=
ادب کی سماجیات: تصور اور تعبیر (منیجر پانڈے)	مترجم: سرور الہدیٰ	۴۰۰/=
دلی کے مسلمان دانشور (انیسویں صدی) مصنف: مشیر الحسن		
	مترجم: مسعود الحق	۲۷۵/=
گفتگو ان کی	اطہر فاروقی	۱۵۰/=
جہان اقبال	عبدالرحیم خاں	۷۵/=
کرشن چندر کے ناولوں کا تنقیدی مطالعہ (سیاسی اور سماجی پس منظر میں)		
	ڈاکٹر عبدالسلام صدیقی	۸۵/=
ہم سفروں کے درمیان	شمیم حنفی	۱۵۰/=
ڈاکٹر بشیر بدر کی شاعری (دیوناگری)	ڈاکٹر انجم بارہ بنکوی	۹۰/=
محقق غالب کالی داس گپتا رضا	محمد عارف خاں، ثاقب صدیقی	۸۰/=
ہماری رسمیں	ڈاکٹر نریش	۸۵/=
خواجہ غلام السیدین	پروفیسر آل احمد سرور	۲۲۰/=
خواجہ غلام السیدین (مضامین اور تقریریں)	خلیق انجم	۱۰۰/=
اقبال یورپ میں	ڈاکٹر سعید اختر درانی	۲۵۰/=
دیوان بیان (احسن اللہ خاں بیان)	ارجمند آرا	۱۵۰/=
نوادر اقبال یورپ میں	ڈاکٹر سعید اختر درانی	۱۳۰/=
بھگوت گیتا (اردو منظوم)	شان الحق حقی	۷۰/=
جگنوؤں کی دنیا	قرۃ العین حیدر	۲۰/=
انتخاب جدید (۱۹۱۴ء تا ۱۹۳۲ء)	آل احمد سرور، عزیز احمد	۱۲۰/=
مصطلحات ٹھگی (علی اکبر الٰہ آبادی)	رشید حسن خاں	۱۲۰/=
انتخاب عزیز لکھنوی	خلیق انجم	۳۰/=
انتخاب فراق گورکھپوری	انجمن ترقی اردو (ہند)	۳۰/=

شاعرانہ نوک جھونک

قطب شاہی دور میں ملا وجہی اور غواصی کے درمیان بھی شاعرانہ چشمک رہی ہے۔ ملا وجہی بادشاہ وقت کے استاد تھے اور ان کو ملک الشعرا ہونے کا شرف بھی حاصل تھا۔ ان ہی وجوہ کی بنا پر غواصی کو ان کے خلاف کہنا مشکل تھا۔ البتہ کٹوراحوض میں جہاں شام کے وقت مختلف شعرا اپنے چاہنے والوں کے ساتھ ٹکڑیوں میں بیٹھا کرتے اور مختلف شعری عنوانات پر گفتگو ہوتی۔ ایسے موقعوں پر غواصی اپنے دل کا بخار ہلکا کرتے تھے۔

مصحفی اور انشا اپنے وقت کے نامور شعرا تھے۔ ان دونوں کے درمیان جو نوک جھونک ہوئی اس تعلق سے محمد حسین آزاد کہتے ہیں: "شرم کی آنکھیں بند ہوگئیں اور بے شرمی کی زبانیں کھل گئیں"۔ دونوں شعرا اپنے وقت کے زود گو شعرا تھے۔ مصحفی نے نہ صرف شاعری کی بلکہ کئی شاعروں کو صاحب دیوان شاعر بنادیا۔ اس کے باوجود بھی مصحفی نے آٹھ ضخیم دیوان چھوڑے۔ جس دور میں مصحفی پر ضعیفی طاری ہورہی تھی، ان کے بال سرخی مائل (بوجہ خضاب) ہوگئے تھے۔ انشا نے ان پر طنز کرتے ہوئے کہا:

صفرے پہ ظرافت کے ذرا شیخ کو دیکھو
سر لون کا منہ پیاز کا انگور کی گردن

انشا اپنے گلے میں دوپٹہ ڈالے رہتے تھے جس پر مصحفی نے طنز کرتے ہوئے کہا:

باندھی دم لنگور میں انگور کی گردن

اس طرح روز مرہ کے سوال و جواب مصحفی کو ناگوار خاطر ہو رہے تھے۔ شہر لکھنؤ میں ان کے تلامذہ کی کثیر تعداد تھی، انھوں نے اپنے استاد کی ناگواری کو پیش نظر رکھتے ہوئے حضرت انشا کی شان میں ایک زوردار ہجو لکھی اور دن اور وقت طے کیا اور ہجو یہ اشعار پڑھتے ہوئے انشا کے مکان پہنچے۔ انشا کو قبل از وقت اس شرارت کا پتہ چل گیا تھا۔ انھوں نے امرائے شہر اور اپنے دوست احباب کو بھی اپنے ہاں مدعو کرلیا۔ مکان کو سجایا اور مٹھائی، پان اور پھولوں کے ہاروں سے مصحفی کے ہمنواؤں کا استقبال کیا۔ ہجویہ اشعار کی تعریف کی، شربت پلایا، پان کھلائے، ہار پہنائے، ہنسی خوشی ان سب کو وداع کیا۔

جواباً انشا نے اپنے ہمنواؤں کو جمع کیا اور ہجویہ کلام کے ساتھ ایک جلوس کی شکل میں ہاتھیوں پر سوار لوگ ایک گڈا اور ایک گڑیا کو لڑاتے، ہجویہ اشعار پڑھتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ ہجویہ کلام کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

سوانگ لایا ہے نیا چرخ کہن
لڑتے ہوئے آئے ہیں مصحفی و مصحفن

اس معرکے میں شہزادہ سلیمان شکوہ اور دیگر امرائے سلطنت نے انشا کا ساتھ دیا اور مصحفی کو خفت اٹھانی پڑی۔ ان باتوں سے مصحفی بہت دل گرفتہ ہوگئے تھے۔ غزلوں کے اشعار میں وہ رنجیدہ خاطر

ڈاکٹر سید بشیر احمد (فلیٹ نمبر B-1، سکھ منی اپارٹمنٹ، لکڑی کاپل، حیدرآباد-۵۰۰۰۰۴)

نظر آتے ہیں:

مصحفی بے لطف ہے اس شہر میں زندگی
سچ ہے کچھ انسان کی توقیر نہیں یاں

اس دور میں مصحفی جیسے زود گو شاعر کو وہ مقام نہیں مل سکا جس کے وہ مستحق تھے، چناں چہ اس تعلق سے محمد حسین آزاد کی رائے یہ ہے کہ "جس شخص کا قلم آٹھ دیوان لکھ کر پھینک دے اس کی قابلیت میں کلام کرنا انصاف کی جان پر ظلم کرنا ہے" اور نیاز فتح پوری کہتے ہیں کہ "اس دور میں مصحفی اپنے فن کا امام تھا اور غزل گوئی میں ایسے ایسے پاکیزہ اسلوب بیان پیدا کیے کہ اس سے قبل کسی شاعر کو اس حیثیت سے مصحفی کے مقابلے میں پیش نہیں کیا جاسکتا"۔

انشا نے نواب سعادت علی خاں کے دربار میں خاص مقام حاصل کرلیا تھا۔ ایسا مقام کسی اور شاعر کو مشکل ہی سے میسر ہوا ہوگا لیکن یہی قریبی تعلق انشا کے زوال کا باعث بنا۔ اپنی ظریفانہ باتوں اور شوخی طبع سے نواب صاحب سے بے تکلف ہوگئے تھے۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ دوپہر کے وقت وہ نواب سعادت علی خاں کے ساتھ کھانا تناول فرما رہے تھے۔ موسم گرما شباب پر تھا، انشا نے اپنی دستار اتار کر پیچھے رکھ دی تھی۔ نواب نے انشا کے مونڈھے ہوئے سر کو دیکھ کر پیچھے سے ایک چپت رسید کردی، انشا سنبھل گئے اور دستار سر پر رکھ لی اور کہا "سبحان اللہ بزرگ لوگ سچ کہا کرتے ہیں کہ ننگے سر کھاتے وقت شیطان دھول لگایا کرتا ہے"۔ طبیعتاً سعادت علی خاں سنجیدہ مزاج آدمی تھے۔ انشا کی وقت بے وقت نامناسب حرکات کو وہ زیادہ دن برداشت نہیں کرسکے۔ انھوں نے انشا کی دربار میں آمد و رفت کو روک دیا اور گھر سے باہر نکلنے پر بھی پابندی عائد کردی۔ ان پابندیوں سے انشا بہ تدریج مفلوک الحال ہوگئے۔ شاہی عتاب، معاشی پریشانیاں اور اس پر جوان بیٹے کا انتقال کرجانا انشا کے اوسان خطا کرنے کا باعث ہوا۔ آخری زمانہ انشا نے بڑی نکبت میں گزارا۔ انشا نے جو بڑے بانکپن سے زندگی گزاری تھی، بعد میں یہ حال ہوگیا تھا کہ نہ وہ جامہ زیبی تھی نہ وہ چہرے پر بشاشت۔ ایک مشاعرے میں وہ میلے کچیلے کپڑے پہنے پہنچے اور اپنا میلا سا تھیلا بازو میں رکھ کر زمین پر بیٹھ گئے۔ لوگوں نے عرصہ بعد اس جلسے میں ان کو دیکھا تو رنج و غم اور تجسس سے ان کے حالات جاننے کی کوشش کی۔ انشا جواب دہی سے تعرض کرتے ہوئے ان لوگوں سے دریافت کیا کہ "مشاعرہ کب شروع ہوگا" لوگوں نے ان کو بتایا کہ "ابھی کافی وقت لگے گا ابھی تو لوگ جمع ہو رہے ہیں"۔ انھوں نے کہا کہ "ہم تو اپنی غزل سنادیتے ہیں" اور غزل پڑھنی شروع کردی:

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

غزل کیا تھی رنج و الم، حسرت، مایوسی اور ناکامی کا دردناک نوحہ تھا۔ انھوں نے غزل ختم کی، کاغذ پھینکا اور شان بے نیازی سے محفل سے چل پڑے۔ انشا کے ہم عصر شاعر رنگین اپنے دوست کا حال معلوم کرنے ان کے پیچھے دوڑ پڑے۔ انھوں نے دیکھا جہاں امارات کا دور دورہ تھا وہاں پر ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ رنگین نے انشا کو آواز دی اور حال دریافت کیا۔ انشا نے حسرت بھری نظروں سے رنگین کو دیکھا اور "شکر ہے" کہا اور ان کی روح پرواز کرگئی۔

انشا کی اس دردناک موت سے ان کے چاہنے والے ملول ہوئے حتی کہ ان کے حریف مصحفی بھی ان کے اس دردناک انجام سے بڑے متاثر ہوئے۔ ذیل میں مصحفی کا ایک شعر درج کیا جاتا ہے جس سے انشا کی اندوہناک موت سے مصحفی کے قلبی تاثرات کا اظہار ہوتا ہے۔

مصحفی کس زندگانی پر بھلا میں شاد ہوں
یاد ہے مرگ قتیل و مردن انشا مجھے

مصحفی ۱۲۳۵ھ میں اس دار فانی سے کوچ کرگئے۔

معاشرے میں عام طور سے ہم پیشہ افراد میں نوک جھونک کے واقعے منظر عام پر آتے رہتے ہیں۔ ادبی و شعری محفلوں میں بھی ایسے واقعات ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ اردو کے عظیم المرتبت شاعر مرزا غالب اور استاد شاہ ابراہیم ذوق ہم عصر شعرا تھے۔ ان دونوں میں آپسی چشمک کے بے شمار واقعات ظہور پذیر ہوئے۔ ذیل میں ایک واقعہ درج کیا جاتا ہے۔ ایک بار مرزا غالب اپنی ڈیوڑھی میں ٹہل رہے تھے اور ان کے پیچھے ان کے شاگرد بھی تھے۔ اتفاق سے دوسری سمت سے ابراہیم ذوق کی سواری آرہی تھی۔ غالب نے ان کو دیکھ کر قدرے بلند آواز سے یہ مصرعہ پڑھا:

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا

غالب کا طنز سن کر ذوق دل ہی دل میں کڑھتے رہے۔ دوسرے دن انھوں نے

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

مدیر: اطہر فاروقی
شریک مدیر: محمد عارف خاں
پرنٹر پبلشر: شاہد خاں   مطبوعہ: شمر آفسٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲، راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
قیمت (فی شمارہ): دو روپے، سالانہ: ۸۵ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر)
Phones: 23237210, 23236299, Fax: 011-23236299
E-mail: hamarizaban@atuh.org
htp://www.atuh.org